اقبال اورتحریک آزادیِ ہند

پروفیسرعبدالحق

اقبال کی شاعری کے دوایسے منفرد پہلو ہیں جس کی نظیر عالمی ادب میں شاید ہی ملے۔ان کا کلام عصری واقعات اور حادثات کا جامِ جہاں نما ہے جس میں رنج و راحت کے کئی پہلو بہت نمایاں ہیں۔ دوسری انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے شعروتخلیق کو عالمی معاملات ومسائل کی آ گہی بخشی۔اردو آفاقی وسعتوں سے ہم کنار ہوئی جبکہ ملک کے دوسرے ادب محدودتصورات میں بند رہے۔ان کی تخلیقات میں تیرہ سو سے زائد آثار واسماء واماکن کے حوالے ہیں۔ایشیائی ملک وملت کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک کے نام بھی کلام میں موجود ہیں۔جیسے امریکہ، اندلس، انگلستان، جاپان، جرمنی، فرانس، مصر، ولایت، ہسپانیہ، یورپ، یونان وغیرہ کے ساتھ متعدد شہروں ومقامات کے ساتھ شعراء، سیاست دانوں، مفکرین و مصلحین کے نام درج ہیں۔ ان ملکوں اور شہروں کی تاریخ وتحریک نیز عصری کوائف پر اقبال کی نظر ہمیں حیرت میں مبتلا کرتی ہے۔ان کے بیانات کا یہ عالمی منظر نامہ بھی ان کی بصیرت کے یقین کے لیے کافی ہے۔ یہ ان کی وسعتِ نظر ہے کہ وہ پوری کائنات سے سروکار رکھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے قلب ونظر کو اس برصغیر سے جو شیفتگی ہے وہ کسی دوسرے خطۂ ارض سے نہیں ہے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ اقبال اور ان کے اسلاف کا مسکن و مدفن ہونے کے ساتھ ان کے تاریخ وتہذیب کا عروج وزوال بھی اسی خاک وخمیر سے وابستہ رہا ہے۔

براعظم کی بیداری کے نقیب کے لیے ناممکن تھا کہ وہ برصغیر سے بے نیاز ہوتے اور ہندوستان کے متعلقات سے بے خبر رہتے۔ یہ ملک اپنی وسعتوں اور درپیش مسائل کی پیچیدگیوں کے اعتبار سے ایشیائی مسائل سے کم نہ تھا۔ بلکہ اس ملک کے مسائل سے براعظم براہ راست جڑا ہوا تھا۔ بہت سے ممالک کی طرح یہ بھی مغرب کی غلامی کے لیے مجبور تھا۔ استبداد اور استحصال میں بھی کمی نہ تھی۔ دوسرے ممالک کے مقابلے میں اس کے حدود اور آبادی کے ساتھ مسائل زیادہ سنگین تھے۔انگریزی اقتدار کی ستم رانیاں بھی کم نہ تھیں۔ یہاں کی غلامی اور بے بسی نے ہی اقبال کو بڑے تناظر میں سوچنے کے لیے مجبور کیا۔ برصغیر کی بدحالی نے براعظم کی کسمپرسی کی طرف توجہ دلائی اور اقبال کے شعور کو عالمی زاویۂ نگاہ بخشا۔ بالفاظِ دیگر سفالِ

ہند کے چھوٹے سے پیمانے میں شامل تھوڑی سی شراب نے رند کو راز گنبد مینا سمجھنے کا موقع دیا۔ یہ نکتہ بھی پیش نگاہ رہے کہ اس دور کے بعض اکابرین کو بصیرت آفریں نظر حاصل تھی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے ایشیائی ممالک کی آزادی کو لازم وملزوم سمجھتے تھے۔ یہ ایک سیاسی اور دفاعی حکمتِ عملی تھی وہ جبل طارق کے چودہ کلومیٹر چوڑے آبی راستے اور ایک سونوے کلومیٹر سویز کی حاکمیت سے انگریزی حکومت کی شہ رگ کو کاٹنا چاہتے تھے۔ اس فکر کی دانائی سے بعض دانشوروں کو اتفاق نہ تھا۔ گاندھی جی کی خلافت تحریک کی حمایت کرنے پر خود ان کی جماعت کے کچھ لوگ معترض تھے۔ یہ حضرات جغرافیائی، دفاعی اور اقتصادی آگہی سے زیادہ باخبر نہ تھے۔ مگر اقبال کی دروں بینی شفاف آئینے کی طرح دیکھ رہی تھی۔ پنڈت نہرو کی گوا پر قبضے کی کامیابی میں جمال عبدالناصر کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، جس نے پرتگالی لشکر اور فوجی ساز وسامان سے لیس بحری جہازوں کو سویز نہر سے گزرنے نہیں دیا۔ اقبال کی حکیمانہ تخلیق کی معنویت کو اس سیاق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فکر وتدبر کے سلیقے کا تقاضا ہے کہ ان کے جہانِ معنی سے سرسری نہ گذرا جائے۔

اقبال نے بارہا تاکید کی ہے کہ انھیں صرف نوائے پریشاں کی شاعری کا ترجمان ہی نہ سمجھا جائے۔ وہ جہاں داری کے بھی محرم راز ہیں۔ اقبال نے ملکی اور بین الاقوامی صورتِ حال یا سیاسی کشاکشوں کے دل دوز تذکرے سے اردو کو روشناس کرایا اور شعری اظہار کو عالم گیر مسائل کا متحمل قرار دیا۔

ایک دوسرے زاویہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اقتصادیات پر صرف پہلی کتاب ہی نہیں لکھی تھی بلکہ یہ مسئلہ ان کی فکر میں اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ ملک کی ابتر معاشی صورت حال سے اقبال باخبر تھے۔ ہندوستان کے معاشی استحصال پر ان کے فکر انگیز خیالات کو بھی اسی تحریک آزادی کے سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انگریز کی تاجرانہ عیاری سے یہاں کے تخت وتاج کے مالک بنے تھے:

تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج
از تجارت نفع و از شاہی خراج [۱]

قالی از ابریشم تو ساختند
باز او را پیش تو انداختند [۲]

سرما کی ہواؤں میں عریاں ہے بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ [۳]

اس معاشی استحصال سے کشت دہقاناں خراب ہے۔ کشت وکسان ہو یا خرمن وخوشۂ گندم اقبال نے بڑی پرسوز انقلابی اور باغیانہ آوازیں بلند کی ہیں:

اس کے آب لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا[4]

اقبال ہر دور میں ہندوستان کا اکرام واحترام کرتے رہے اور بھولے سے بھی وہ کبھی غافل نہ ہوئے۔ یہاں کے ذروں سے قلبی وابستگی فکری عقیدت کی حد تک پہنچ چکی تھی۔۱۹۰۴ء میں 'سارے جہاں سے اچھا' اور 'خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے' کہنے والے اقبال ہیں۔ پھر ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ میں رودِ کاویری کو جو خراج پیش کیا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ سرزمین ہند سے ایسی والہانہ محبت کرنے والا تاریخ ادبیات میں ناپید ہے:

اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات
اے دکن را آبِ تو آبِ حیات[5]

ہندیاں بے گانہ از ناموسِ ہند[6]

یا پھر ۱۹۳۶ء میں اس عقیدت کے الفاظ دیکھیے:

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب[7]

ہندوستان کی بدحالی اور باشندوں کی بے حسی کا سب سے الم ناک منظر ملاحظہ کرنا ہو تو جاوید نامہ کے فلک زحل سے رجوع کیجیے۔ ملک سے غداری کرنے والوں کے ذکر سے ہی اس سیاحت کی شروعات ہوتی ہے۔ ارواحِ رذیلہ کا ذکر ہے جنھیں دوزخ نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ غدارانِ قوم کا یہ نفرت نامہ ہے، جو ہماری شعری روایات میں پہلی بار منظر پر آیا۔ روح ہند کے ہونٹوں پر مسلسل نالہ ہائے دردمند کی صدائیں کراہ رہی ہیں:

گفت رومی روح ہند است ایں نگر[8]

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن[9]

دوسرے اشعار میں ہندیوں سے تخاطب ہے:

شمع جاں افسرد در فانوس ہند
ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند[10]

جاوید نامہ ۱۹۳۲ء کی تخلیق ہے:

ملّتے را ہر کجا غارت گرے است
اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں　از　روحِ　جعفر　الاماں
الاماں　از　جعفرانِ　ایں　زماں[۱۱]

آخری تخلیق ارمغانِ حجاز میں ہندوستان کا ذکر ہوتا رہا، اس ملک کی آزادی میں دوسرے ایشیائی ممالک سے غلامی کے خاتمے کا اعلان موجود تھا۔ تاریخ نے ثابت بھی کر دیا کہ برصغیر کے آزاد ہوتے ہی کئی ملکوں میں صبح درخشاں کا آفتاب طلوع ہوا۔ بڑے سے بڑا ملک چین ہو یا چھوٹے سے چھوٹا سری لنکا، سب ۱۹۴۷ء کے معاً بعد آزاد ہوئے۔ اقبال کی بصیرت بہت پہلے بتا چکی تھی کہ ہندوستان ہی ایشیائی ممالک کے مقدر کی سرنوشت لکھنے میں پہل کرے گا۔ دوسرے اکابرین کی فکری بصیرتوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جمال الدین افغانی، مولانا شبلی، مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی، مولانا آزاد وغیرہ کی نظروں میں یہ نکتہ رازِ درونِ فکر بن کر پرورش پاتا رہا۔ اس خطۂ زمین کی خوش حالی دوسرے تمام ملکوں کی آزادی کے بغیر ممکن نہ تھی۔ فکر و فلسفہ کی سطح پر بھی اقبال کی نظر آفاقی وسعتوں پر محیط تھی اور کائناتی انسان ہی ان کا محور تھا۔ وہ جاوید نامہ میں آفتاب کے استعارے سے اپنی انتہائی فکر انگیز بات کہہ چکے تھے کہ گرچہ سورج یورپ سے نکلتا ہے مگر پوری کائنات کو روشن کرتا ہے۔ ہر انسان بھی مثلِ آفتاب ہے۔ اس کی نسبت جائے پیدائش سے ضرور ہے مگر اس کی نگاہ میں ارض و سما کی پہنائیاں ہوتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک غلامی کے خلاف بغاوت کے لیے تین راستے بھی تھے۔ سب سے پہلے وطن عزیز سے بے پناہ محبت کا جذبہ پیدا کرنا۔ دوسری سطح پر تمام قوموں کے درمیان مضبوط رشتۂ اتحاد کا قائم ہونا ''سارے جہاں سے اچھا......''، ''سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں''۔ اور پھر انگریزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا۔ تحریک آزادی کے یہی تین ارکان تھے، جن سے اقبال کی شاعری معمور ہے۔

اقبال کی نشو و نمائے فکر تحریکِ آزادی کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ عمر کے پچیس سال گزرے تھے کہ سیاسی فکر پختگی کی دہلیز پر دستک دینے لگی۔ ۱۹۰۴ء کے اشعار آج بھی ہماری ہر تحریک و تنبیہ کا محاورۂ روز و شب ہیں اور سچ یہ ہے کہ اس وقت تک کسی بھی زمان یا ادب میں ہندوستانیوں کے لیے یہ تخاطب یا تاکیدی کلمات نہیں ملتے۔ اس میں آگہی اور پیامبری کے ساتھ جاں سوز انجام کے خلاف شمشیر بدست ہو کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے کی آرزو بھی شامل ہے۔ شعری زبان میں اسے سب سے پہلی انقلابی آواز اور فرمانِ آزادی کا اعلانیہ کہنا چاہیے:

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں[۱۲]

یہ غیر معمولی دردمندی کا اظہار تھا جو اردو شاعری کے توسط سے ہندوستانی سیاست کا نقیب آزادی بن

کر نمودار ہوا۔ اس سے قبل ایسی آواز ہماری سماعتوں میں نہ تھی۔ غلامی کے خلاف باغیانہ احتجاج کا یہ آغاز تھا جو آزادی کا صور پھونکنے میں آتشِ فروزاں کا کام دے رہا تھا۔ ابھی آزادی کے خد وخال ابھرنے میں تاخیر تھی اور شاعر کی بصیرت دیکھیے کہ ۱۹۰۴ء میں ہی باشندوں کی بے ضمیری کو للکار رہا ہے۔ حمیت و عزیمت کو نفسِ گرم سے آشنا کرنے میں اقبال نے جو حق ادا کیا وہ سیاسی بساط پر بھی ابھی تک نمودار نہ ہو سکا تھا۔ آزادی کی علم بردار جماعت نیشنل کانگریس بھی کوئی ایسا نعرہ نہ دے سکی تھی:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں[۱۳]

وطن کی فکر کر ناداں، تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں اور عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں، لذتِ فریاد پیدا کر، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں، جیسی باغیانہ اور غیرت کو للکارنے والی آوازیں اقبال سے ہی منسوب کی جائیں گی۔ اردو کیا ملک کی تمام لسانی تخلیقات میں باغیانہ لہجے کی یہ شاعری نظر نہیں آتی۔ اس ابتدائی نظم میں تینوں زاویے موجود ہیں۔ یعنی ہندوستان کی عظمت کا اعتراف، انگریزی حکمرانی کے خلاف بغاوت اور باشندگانِ ہند کے مابین محبت و اخوت کا پیغام۔ نظم کے اختتامی دو اشعار ملاحظہ ہوں:

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے[۱۴]

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے[۱۵]

جس طرح اقبال اٹھ کھڑے ہونے کی بار بار تاکید کرتے ہیں وہ کہیں نہیں ملتا:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر[۱۶]

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے[۱۷]

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو[۱۸]

دل و جاں کی قربانی اور سپردگی کا یہ پیغام غلامی کے خلاف صدائے دردناک تھی، جو رحیلِ کارواں کے لیے ضروری تھی۔ اقبال کی شاعری میں 'ستیزی' اور 'رستاخیزی' کے الفاظ کے محل استعمال اور معنویت پر غور کیجیے تو یقین آئے گا کہ وہ پوری قوم کے کمر بستہ ہونے کے لیے مضطرب ہیں اور ان لفظوں کو چن چن کر

استعمال کرتے ہیں جن میں جگرتابی اور جاں سوزی کے مفاہیم موجود ہیں۔ وہ بیداری کے پہلے نقیب ہیں، جنھوں نے صدیوں کی خواب آوری اور ناکردہ کاری کے خلاف بغاوت برپا کی۔ ان ترانوں کو دیکھیے جن میں للکارنے اور لائحہ عمل کو متعین کرنے کی تڑپ موجود ہے۔ پوری شاعری میں یہ پہلی آواز تھی: خواب سے جاگو، اٹھو، تیار ہو، چلو اور پھونک ڈالو، برہم کردو، لہو گرم کرو، خونی کفن پہنو، تیشہ وتبر سے کام لو، شمشیر و سناں باندھو، مردانہ وار نہیں جی سکتے تو موت کو مردانگی سے قبول کرو جیسے شورانگیز خطابات ان کی شاعری میں ہی دستیاب ہیں۔ ان لفظوں کو دیکھیے جو قیامت خیز طوفان برپا کرنے والی شاہ کار تخلیق ہیں:

از گرمیِ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز!
از خواب گراں خیز![۱۹]

خیز، برخیز، رستاخیز، برانگیز، برفشاں، پیہم دواں، ہردم جواں، ہشیار، بیدار، بےقرار جیسے سیکڑوں الفاظ صرف شعری تلازمے نہیں ہیں بلکہ اقبال کی انقلابی فکر اور احتجاجی اظہار کے ترجمان ہیں، جو آزادی کے فراواں احساس اور استحضار کی علامت ہیں۔

آخری بند میں انگریزی جابریت کے خلاف جنگ جوئی کو عمرِ رواں کا حاصل قرار دیا گیا ہے۔ اس آمریت کے خاتمے کے لیے بیدار بختی کی بشارت بھی دی گئی ہے:

فریاد ز افرنگ و دلآویزیِ افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزیِ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خوابِ گراں خیز![۲۰]

اسی زبورِ عجم کی دوسری تخلیق میں 'انقلاب' کے لفظ کو پہلی بار پُراسرار معنویت دی گئی۔ انقلاب ہو یا احتجاج، اعتراض ہو یا انتقام، شاعری ہو یا سرکشی، بغاوت ہو یا خطابت سب اقبال کے دیے ہوئے نعرۂ انقلاب کے مرہونِ منت ہیں:

جانِ محکوماں ز تن بردند و محکوماں بخواب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب![۲۱]

کیسی پتے کی بات کہی ہے کہ فریب دے کر میر و سلطاں نے ہندی غلاموں کے جسم سے روح غصب کر لی ہے اور محکوم محوِ خواب ہے۔ انقلاب کو آواز دو کہ شورشِ سلاسل بر پا ہو۔ نو بند کی اس نظم میں نظامِ حکومت کو دَرہم کرنے کا پیغام ہے۔

اقبال نے ۱۹۰۷ء میں ہی یہ شور انگیز پیغام سرزمین یورپ سے سنایا تھا۔ مغربی تہذیب کے خلاف کسی ہندوستانی کی یہ پہلی آواز تھی جو بانگ درا اور بانگِ رحیل بن کر نمودار ہوئی تھی:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائدار ہوگا[۲۲]

اقبال ابھی اسپنگلر کی کتاب زوالِ مغرب سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۰۷ء کی یہ احتجاجی آواز چالیس سال بعد اذانِ آزادی ثابت ہوئی۔ اقبال کی آرزو تھی کہ اگر وہ صبحِ آزادی کا نغمۂ نو بہار نہ بن سکیں تو کم سے کم سوزِ اقبال کو یہ توفیق ملے کہ بہار سے پہلے آنے والے پرندوں کی طرح آزادی کی خبر دے سکیں۔ ان کی دعا مستجاب ہوئی۔

خلافت تحریک زوروں پر تھی۔ ملک کا ہر پیر و جواں خلافت پر جان دینے کے لیے آمادۂ پیکار تھا۔ اقبال کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ انھیں دریوزہ گری سے نفرت تھی۔ ان کا قول سنیے:

خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی[۲۳]

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد[۲۴]

ان مصرعوں میں ایک آسمانی آواز شامل تھی۔ اس کے مخاطب بھی ہندوستانی ہی تھے، جن کے خاکستر کی چنگاری سے مشرقی ممالک میں صورِ اسرافیل سنی جا رہی تھی۔ اب سرمایہ دار اور مزدور کی کشاکش بھی شامل ہوگئی۔ کیوں کہ تلاطم ہائے دریا سے ہی گوہر کی سیرابی ممکن ہے۔ تبھی کبوتر کے تنِ نازک میں شاہینی جگر پیدا ہوگا اور فرنگی مدنیت کا خاتمہ ہوگا، کیونکہ:

تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا[۲۵]

انھیں انجام تک پہنچانا بھی ہے۔ محکوم قوم کا لہو گرم ہو چکا ہے جس سے جہانِ چارسو کانپ رہا ہے۔ اب سرمایہ داری یعنی انگریزی سامراج کا نظام ختم ہونے کو ہے اور اقبال ان کے سفینے کے ڈوبنے کے منتظر ہیں۔ زمین و آسماں کو خاکستر بنا دینے کا عزم اقبال دیتے ہیں۔

ان بیانات کے بعد یقین کے ساتھ باور کرنا چاہیے کہ برصغیر کی بیداری و آزادی کی جدوجہد میں ان کے انقلاب آفریں پیغام کی صدائے بازگشت ہر سو سنائی دیتی ہے۔ شاید ہم ابھی تک ان آوازوں کی سماعت کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں یا اقبال کے فروغِ فکر کی تجلیات تک رسائی میں ہماری دانش و بینش کے پر جلتے ہیں۔ یا ہم بے بنیاد توہمات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہم برملا اقرار و اعتراف کریں یا نہ کریں درونِ دل اقبال کی ان آوازوں کے مؤثرات سے متاثر اور معترف ہیں۔ پس از مرگ بھی ان کی لحد اہلِ عزم و ہمت کے لیے زیارت گاہ ہے۔ انھوں نے خاک نشینوں کو اسرار سلطانی اور رازِ الوندی سکھائے ہیں۔ یہ عرفان بھی توجہ طلب ہے کہ اگر وہ چہرۂ افکار کے دبیز پردوں کو چاک کر دیں تو ان نواؤں کی تاب و تپش اہلِ فرنگ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔ کیوں کہ:

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا[۲۶]

یا

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب[۲۷]

فرنگ سے اس حد تک خطاب کہیں نہیں ملے گا۔

اقبال پہلے شاعر ہیں جو عملی سیاست میں بھی شریک ہوئے۔ پنجاب لجسلیٹو کونسل کے انتخاب اور ۱۹۳۱ء کو گول میز کانفرنس میں 'گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں' کا مشاہدہ کر چکے تھے۔

یہ ایک عمومی تذکرہ ہے جس میں عہدِ اقبال کی سیاسی صورتِ حال اور اقبال کے فکری ردِعمل کے ساتھ ان کی پیامبرانہ شاعری پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ اقبال نے محکوم اقوام کے استحصال کے خلاف جس شدت سے نفرت کا اظہار کیا اور انھیں جنگ کے لیے آمادہ کیا، اس کی مثال برصغیر ہی نہیں بلکہ کرۂ ارض پیش کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اقبال اس حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ وہ پیش گوئی کے قائل نہ تھے لیکن ان کی بصیرتوں میں وجدان و الہام کے مشاہدات اور کرشمہ ساز فکر کسی طرح کم نہ تھی:

مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے[۲۸]

اقبال نے اپنے جس جہاں آشوب نغمے کو لامکاں کے لیے سنبھال کر رکھا تھا اسے انتہائی دردمندی سے براعظم کی بیداری کے قافلے میں لٹا دیا۔ ان کی بصیرت انجم شناسی کو مات دے کر تاروں کی گردش تیز کرنے کے ساتھ دلِ ہر ذرہ کو رستخیزی کے لیے سامانِ سفر فراہم کر گئی۔ آیندہ بیداری بخشنے والی آوازیں اقبال سے ہی منسوب کی جائیں گی:

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید[۲۹]

❁❁❁

حواشی و حوالہ جات

۱- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، فارسی، (پس چہ باید کرد ......)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص۸۴۲۔
۲- ایضاً، ص۸۴۳۔
۳- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، اردو، (ارمغان حجاز)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص۷۵۰۔
۴- ایضاً، ص۴۴۴۔
۵- کلیات اقبال، فارسی، ص۱۷۷۔
۶- ایضاً، ص۳۲۷۔
۷- کلیات اقبال، اردو، ص۶۲۱۔
۸- کلیات اقبال، فارسی، ص۳۱۷۔
۹- ایضاً، ص۳۰۷۔
۱۰- ایضاً، ص۳۲۷۔
۱۱- ایضاً، ص۳۳۷۔
۱۲- کلیات اقبال، اردو، ص۹۹۔
۱۳- ایضاً، ص۱۰۰۔
۱۴- ایضاً، ص۱۰۳۔
۱۵- ایضاً، ص۱۰۲۔
۱۶- ایضاً، ص۱۵۸۔
۱۷- ایضاً، ص۲۹۲۔
۱۸- ایضاً، ص۴۳۷۔

۱۹- کلیات اقبال، فارسی، ص ۴۷۳۔
۲۰- ایضاً، ص ۴۷۵۔
۲۱- ایضاً، ص ۴۸۶۔
۲۲- کلیات اقبال، اردو، ص ۱۶۷۔
۲۳- ایضاً، ص ۲۸۱۔
۲۴- ایضاً، ص ۳۹۶۔
۲۵- ایضاً، ص ۴۱۷۔
۲۶- ایضاً، ص ۶۴۹۔
۲۷- ایضاً، ص ۴۲۸۔
۲۸- ایضاً، ص ۳۸۰۔
۲۹- کلیات اقبال، فارسی، ص ۸۳۹۔